فرخندہ امین
پی ایچ-ڈی سکالر

ترجمہ اور تشکیل اسالیب

Farkhanda Ameen
Ph.D Scholar

Translation and Formation of Styles

The task of translation is not easy. A precise style of an auther, exhibits exact copy of the writer's ideas. So, the translater may opt his model in a number of wayss; He may not hear what is to he heard in it.

The problem of translation may be treated from three angles: Adequate comprehension of the translated text, adequate manipulation of the language translated into, and what happens in between. The last question properly belongs to lingustic psychology. So the translater may introduce writing styles of different foreign writers into his language.

ترجمہ ہمیشہ سے دو تہذیبوں کے درمیان پل بنتا آیا ہے جس کے ذریعے اقوام عالم میں افکار و خیالات، تکنیک اور اسلوبیات کا دوطرفہ سفر جاری و ساری ہے۔ ترجمہ (Translation) کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے پہنچا اور اس کے لغوی معنی ہیں ''پار لے جانا'' اس سے قطع نظر کہ ہر مترجم ارنسٹ منیو لوسا نہیں ہوتا۔ ''پار لے جانا'' کا مفہوم، نقل مکانی سے لے کر مکانی معانی تک پھیلا ہوا ہے اس طرح اردو اور فارسی میں ''ترجمے'' کا لفظ جس کا اشتقاقی رابطہ ترجمان ہے اور مترجم دونوں سے ہے۔ عربی زبان سے منتقل ہوا ہے۔ اہل لغت اس کے چار معنی درج کرتے ہیں: ایک سے دوسری زبان میں نقل کلام، تفسیر و تعبیر، دیباچہ اور کسی شخص کا بیان، احوال یا تذکرہ شخصی، یہ سب معانی لفظ ''ترجمہ'' سے باہم مربوط ہیں۔ حتیٰ کہ ''رجم'' بھی جس کے معنی ہیں 'سنگسار کرنا'، مترجم 'سسی فس' سے مشابہ ہے۔

مختلف ناقدین و مترجمین نے فن ترجمہ سے متعلق مختلف النوع آراء کا اظہار کیا ہے لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ ۴۶ قبل مسیح میں سیسرو نے اس حوالے سے بات کرتے ہوئے اسلوب اور زبان کا حوالہ دیا: ''مترجم کا کام لفظ کی جگہ لفظ رکھنا نہیں بلکہ مصنف کے اسلوب اور زبان کی طاقت کو اپنی زبان میں محفوظ کرنا ہے''۔ ہمارے ہاں معروف انشاء پرداز، شاعر اور تذکرہ نگار محمد حسین آزاد نے ۱۸۸۱ء میں ترجمے کے متعلق کچھ اسی طرح کی رائے دی، جس میں اصل مصنف کی فکر کے ساتھ اس کے اسلوب نگارش کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ آزاد کہتے ہیں کہ ''ترجمہ اور تصنیف کے تجربہ کار جانتے ہیں کہ ان کی عبارت میں کسی زبان کا اصل لفظ جو اپنا

مطلب بتا جاتا ہے، سطر سطر بھر عبارت میں ترجمہ کریں تو بھی وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو مجموعہ خیالات کا اور اس کے صفات و لوازمات کا اس ایک لفظ کے سننے والے کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے''۔ ان تمام حوالوں سے ترجمہ کو اصل کی نقل قرار دینے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''ترجمہ کرنا ایک گناہ ہے''۔ اسی لیے پروفیسر ایلبر ٹ گیرارڈ نے مترجم کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے رائے دی کہ'' ترجمہ، نام ہے ایک سعی نامشکور کا، جس کے صلے میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے''۔[۱]

بہر صورت، ترجمے کی معرفت نہ صرف نئے خیالات کی آمد جاری رہتی ہے بلکہ جس زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے اس کی قوت اظہار میں نئے امکانات بھی پیدا ہوتے ہیں اور نئے اسالیب اظہار وضع کرنے کی طرف تخلیق کاروں کی طبیعت مائل ہوتی ہے۔علم انسانی میں اضافہ اور انسانی ذہن میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) جمال سید میاں نے ترجمے میں پیش آنے والی اڑچنوں اور افادیت سے متعلق بات کرتے ہوئے اسلوب کی منتقلی کی بات کی ہے۔ کہتے ہیں:'' ترجمہ ایک مشکل فن ہے دوسری زبانوں سے صرف الفاظ کا ترجمہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی روح کو بھی دوسری زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے''۔[۲]

آفتاب احمد خاں اسی مشکل کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:'' آپ آزاد ترجمہ کریں یا پابند لفظی، ایک زبان کو دوسری میں کلیتاً منتقل نہیں کیا جاسکتا۔لیکن اس کے قریب تر لے جانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔۔۔ یہ تو ایک ایسا در ہے، جو ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے''۔[۳] پیچھے مڑ کر دیکھیں تو دنیا کا قدیم ترین ادبی ترجمہ ہومر کے رزمیہ ''اوڈلیسی'' کا یونانی سے لاطینی زبان میں ترجمہ تھا۔ یہ ۲۵۰ قبل مسیح کا قصہ ہے جب لیو یوس اینڈ رونیکس (Liviues Andronicus) نے ہومر کے رزمیہ کو لاطینی زبان میں منتقل کیا۔لیو یوس اینڈ رونیکس کے سامنے ترجمہ نگاری کا کوئی اصول نہیں تھا۔ شاید اسی لیے اس نے ترجمے کو ازسرنو تخلیق کرنے کا درجہ دیا۔[۴] تخلیق اس حوالے سے کہ 'اوڈلیسی' کے ہیرو اوڈلیسیس کی زندگی کا متن تو ترجمہ ہونا ہی تھا، وہ اس انداز میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی، جو ہومر کے اسلوب سے قریب تر بھی ہو۔ اردو میں علمی اور فنی تراجم کا ذکر آتا ہے تو ذہن عام طور پر سب سے پہلے انگریزی نگارشات کے اردو تراجم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی سے اردو میں علمی تراجم کا کام ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں شروع ہوا تھا۔ گویا اردو زبان میں ترجمے کی تاریخ ڈیڑھ پونے دو سو سال سے زیادہ پرانی نہیں۔لیکن اگر انگریزی کے علاوہ عربی اور فارسی سے کیے گئے تراجم کو بھی شمار کر لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ فارسی زبان سے اردو ترجمے کا آغاز تین سو چھیاسٹھ برس قبل عہد اکبری کی ایک آزاد سلطنت بیجاپور سے ہوا تھا۔ جہاں حکومت ،مغل دربار میں مروج فارسی کی بجائے مقامی زبان کی سرپرستی کر رہی تھی۔عبید اللہ قدسی کے مطابق :''سب سے پہلا ترجمہ ملک خورشید نے ۱۰۵۶ھ بمطابق ۱۶۴۶ء میں امیر خسروؒ کی مثنوی ''ہشت بہشت'' کے ایک جزو کا اور دوسرا ترجمہ ۱۰۸۱ھ مطابق ۱۶۷۰ء میں طبعی نے نظامی گنجوی کی مثنوی 'ہفت پیکر'' کا ''بہرام وگل اندام'' کے نام سے کیا''۔[۵]

جہاں تک ترجمے کی ضرورت کا معاملہ ہے تو اس حقیقت سے انکار کسی بھی طور ممکن نہیں کہ ادب کی سرحدوں پر پہرے نہیں لگائے جاسکتے ۔ اسی طرح کسی مخصوص علاقے میں بسنے والے یا مخصوص زبان کے بولنے والوں کے تخلیقی تجربے سے استفادہ کرنے پر پابندی عائد کرنا ناممکن ہی نہیں۔ مستحسن بھی نہیں۔ جدید دور میں ذرائع ابلاغ کی ترقی نے دنیا کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس صورتحال میں جہاں دوسری قوموں کی تہذیب و ثقافت سے آگہی نہایت درجہ ضروری ہے اسی طرح دوسری زبان کے

ادیبوں اور دانشوروں کے خیالات سے بہرہ مند ہونا بھی ناگزیر نظر آتا ہے کیونکہ قوموں کے مزاج سے آشنائی کے بغیر دوستی یا دشمنی کی منازل طے کرنا ناممکن ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد اس حوالے سے لکھتے ہیں: ''ترجمہ وہ دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں لیکن جدید عہد میں یہ ایک ضرورت بھی ہے، جس کے بغیر ہم عالمی سطح کی علمی ادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہوسکتے''۔[۶] یوں کہہ لیجئے کہ ترجمے کی ضرورت تہذیبی نشوونما کے لیے ہی نہیں، نئے طرز بیان کے لیے بھی لازمی ہے کیونکہ تہذیبوں اور پیرائیہ اظہار کے سرچشمے ایک خاص مدت کے بعد خشک ہونے لگتے ہیں اور ہم ان خشک سرچشموں سے کچھ نیا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس طرح ذہنی علیحدگی، تہذیبی تعصب اور اسلوبیاتی سطح پر بنجر پن کی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ ان بیماریوں کا تدارک و علاج ترجمے کی بدولت ممکن ہے۔ یوں نت نئے خیالات کی ترویج اور نئے پیرایہ اظہار کی تشکیل کی خاطر تراجم کی ضرورت نہ صرف ایک اجتماعی تقاضے کی سطح پر ابھرتی ہے بلکہ علمی اور ادبی سطح پر ناگزیر ہو جاتی ہے۔ یعنی ترجمہ ادبی جمود کو ختم کر کے تخلیقیت کو بڑھاوا دیتا ہے۔ اسی لیے مولوی عبدالحق نے کہا تھا کہ ''ادبیات کے میدان میں پہلی منزل ترجمہ ہوتی ہے''۔[۷]

ڈاکٹر سہیل احمد خاں کا کہنا یہ ہے کہ ''پابندیوں کے زمانے میں ایسے افسانوں اور ایسی نظموں کے تراجم زیادہ ہونے لگتے ہیں جن میں پابندیوں کے خلاف باغیانہ لہجہ یا جبر کا احساس نمایاں ہو۔ ایسی صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے ادیبوں کی یہ روحانی ضرورت بن گئی ہے یا وہ شعوری طور پر تہذیبی اور سماجی پس منظر میں ایسا کرنے پر مجبور ہیں وہ جو باتیں خود بیان نہیں کر سکتے انہیں ترجموں کی زبان سے ادا کر رہے ہیں''۔[۸] احتیاط کا تقاضا ہے کہ مترجم حقیقی مناسبت کی تلاش کرتے ہوئے زبان و بیان کے استعمال میں احتیاط برتے مناسب اور موزوں الفاظ کا انتخاب اس کے علاوہ ہے۔ مترجم کو علم ہونا چاہیے کہ آیا کون سے محاورات، تشبیہات، علامات اور ضرب الامثال استعمال کرنے چاہیے کہ مصنف کے خیالات کے ساتھ انصاف بھی ہو سکے اور عبارت میں مصنف کا اسلوب بھی در آئے۔ مترجم کی اسی نوع کی مشکلات پر بات کرتے ہوئے الیاس عشقی کہتے ہیں: ''ترجمہ ایک دشوار فن سمجھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے بڑے بڑے مترجم اپنے کام سے خوف زدہ رہے ہیں۔ اس خوف کے کئی ڈراؤنے پہلو ہیں، جتنا خوف اتنے وسوسے، ہزار باتیں سننے میں آتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مترجم کے لیے اسی پائے کے علم اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کتاب اور فن پارے کے مصنف کا ہو، جس کا ترجمہ کرنا مقصود ہو۔ مصنف تو جس زبان میں لکھتا ہے، چاہے اس زبان کا ماہر ہو نہ ہو لیکن مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان زبانوں کا ماہر ہو، ایک وہ زبان جس کا ترجمہ کرنا ہے دوسری وہ، جس میں ترجمہ کرنا ہے، اس لیے اصل مصنف کے انداز بیان اور لسانی خصوصیات کے علاوہ اگر اس کے تعلیمی معیاروں، اس کے عام حالات زندگی اور اس سے متعلق اس کا نقطۂ نظر اور عصری تقاضوں سے جس قدر واقفیت ہوگی اس کے لیے اتنا ہی بہتر ہے۔ یہ اور ایسی بہت سی باتیں مترجم کے کام کو دشوار بناتی ہیں لیکن یہ سب باتیں نصف حقیقتیں ہیں۔ دنیا کے بہتر مترجم ان تمام خصوصیات پر پورا نہیں اترتے۔ اگر یہ باتیں کسی ایک شخص میں مجتمع ہو بھی جائیں تو یہ کب ضروری ہے کہ لازمی طور پر وہ ایک اچھا مترجم بھی ثابت ہوگا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ترجمہ کیسا ہی تخلیقی کیوں نہ ہو آخر ترجمہ ہی ہوتا ہے۔ ترجمہ کا کام اگرچہ بنیادی طور پر ترجمانی ہے لیکن اس سادہ لفظ سے حقیقت حال پوری طرح واضح نہیں ہوتی''۔[۹] ترجمے کے ذریعے اسالیب کو ترقی دینا مقصود ہے تو اردو میں ترجمہ کرنے والے مترجم کی شخصیت میں چار بنیادی حوالوں کا احساس بہر طور موجود رہنا چاہیے:

۱۔ اردو لشکری زبان ہے اور اس میں مختلف زبانوں کے کثیر الفاظ مستعمل ہیں۔ مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان الفاظ کی

بنیادی حیثیت سے آگاہ ہو اور مفہوم پر بھی دسترس رکھتا ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کلاسیکیت کے رکھ رکھاؤ کی تگ و دو میں عہد موجود کی نفطیات کو رد کر دے۔ اسے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ جو لفظ اردو میں مستعمل ہوا، وہ اردو کا ہو گیا۔

۲۔ مترجم لفظ اور مرکبات کے استعمال سے پوری طرح آشنا ہو۔ اسے پرشکوہ انداز بیان اور محض سادگی و سلاست میں فرق کا پتا ہو۔

۳۔ بعض اوقات ترجمہ کرتے ہوئے کسی ایک تصور یا خیال کو سادہ الفاظ میں بیان کرتے ہوئے طوالت بڑھ جاتی ہے جو کہ مناسب عمل تصور نہیں کیا جاتا لہٰذا اس سلسلے میں اصطلاحات کا استعمال اور بوقت ضرورت نئی اصطلاحات تشکیل دینے کا اہل ہونا مترجم کی تخصیص شمار ہوگی اور اسالیب بیان میں نیرنگی پیدا ہوگی۔

۴۔ عبارت کی سجاوٹ اور روانی اس وقت متاثر ہوتی ہے جب اس میں پرتکلف الفاظ و مرکبات کی تعداد بڑھ جائے۔ لہٰذا مترجم کو اپنی حدود و قیود کا علم ہونا چاہیے۔

۵۔ ترجمے میں اگر مانوس مقامی الفاظ استعمال کرنا ناگزیر یا مناسب ہے/ ہو تو اس سے ہچکچانا نہیں چاہیے۔

۶۔ وہ زبان جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے، کے مترادفات اگر اردو میں موجود ہوں تو محض آسانی کی خاطر انگریزی الفاظ سے صرف نظر کرنا چاہیے۔

۷۔ ترجمہ کرتے وقت ہر لفظ کے لیے اردو کا ایک لفظ استعمال کیا جائے بشرطیکہ خود ترجمہ ہونے والے لفظ کے متعدد معنی نہ ہوں۔ مثلاً لفظ ''ڈیفنس'' کے لیے لفظ دفاع استعمال کیا جائے، نہ کہ کہیں 'تحفظ' اور کہیں 'حفاظت' اگر مفہوم کے اعتبار سے معنی مختلف نکلیں تو اس کا استعمال نوعیت پر ہوگا۔ مثلاً 'Case' کا عدالتی ترجمہ 'مقدمہ' طب میں ''مریض'' اور دفتری معمولات سے متعلق ''معاملہ'' ہونا چاہیے۔

۸۔ بہت سے انگریزی الفاظ اردو کا جزو بن چکے ہیں انہیں ویسے ہی استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، مثلاً رجسٹری، ٹکٹ، بل وغیرہ۔

۹۔ بہت سے انگریزی الفاظ بگڑی ہوئی صورت میں مستعمل ہوئے اور بہت مانوس ہو گئے۔ انہیں ویسے ہی استعمال کریں مثلاً کارتوس، لالٹین، اردلی وغیرہ۔

۱۰۔ اگر انگریزی اصطلاح اور اس کا اردو متبادل دونوں یکساں مقبول ہوں تو دونوں کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ جیسے 'کمیٹی' اور ''مجلس'' وغیرہ۔

۱۱۔ جس موضوع سے متعلق ترجمہ کرنا ہو تو اس پر سیر حاصل مطالعہ ناگزیر ہوگا یوں متعلقہ مفاہیم واضح ہو جائیں گے۔

۱۲۔ انگریزی مخففات کا ترجمہ ان کے مکمل حوالے سے کیا جائے گا۔ مثلاً انگریزی میں ''گورنمنٹ'' کے لیے "Govt." کا مخفف مستعمل ہے مگر ترجمہ کرتے وقت مکمل صورت ''گورنمنٹ'' یا ''حکومت'' ہی کا چناؤ کیا جائے۔

۱۳۔ علمی کتاب کے ترجمے میں پوری کتاب کا مطالعہ کر کے اصطلاحات کا ترجمہ ایک ہی انداز سے کرنا مناسب ہوگا یعنی ایک اصطلاح کا ترجمہ پوری کتاب میں ایک ہی رکھا جائے گا۔

۱۴۔ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ اور محاورہ زبان کے مطابق ہو۔ اصل زبان کا محض خلاصہ مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ اگر عبارت پیچیدہ اور جملہ طویل ہے تو کوشش کی جائے کہ ترجمہ بھی ویسا ہی ہو۔ طویل جملے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ترجمہ کرنا مترجم کی کمزوری تصور ہوگا۔ اس ضمن میں محمد حسن عسکری کو راہنما بنایا جائے۔ انہوں نے گستاوَ فلابئیر کے اول ''مادام بواری'' کو ترجمہ کرتے وقت فلابئیر کے پورے پورے صفحے پر مشتمل جملے کو اردو جیسی قدرے نئی زبان میں اس طرح ترجمہ کر کے دکھا دیا۔

۱۵۔ یہ کہنا کہ ترجمہ سبک اور عام فہم ہو، ایک جاہلانہ بات ہے اور ترجمے کی فلاسفی سے ناوقفیت کی دلیل ہے۔ اگر ایسا ہوگا تو نئے اسالیب بیان کہاں سے جنم لیں گے؟

اردو میں کیے گئے ترجموں پر عسکری صاحب کو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ مجموعی طور پر ترجموں کے ذریعے ہمارے تخلیق ادب کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ محمد حسن عسکری کہتے ہیں کہ '' ابھی تک تو ہمارے یہاں ترجمے اس نقطۂ نظر سے کئے اور پڑھے جاتے ہیں کہ اردو پڑھنے والوں کو بھی اصل کتاب کی کہانی معلوم ہو جائے۔ ترجموں سے زیادہ سے زیادہ اثر ہم لوگ یہ لیتے ہیں کہ ہمارے ادیب بھی ویسے ہی موضوعات پر لکھنے لگتے ہیں، لیکن ترجمے کی بدولت ہمیں ایسا تخلیقی جذبہ نہیں ملتا جیسا سرشار کو مل گیا تھا۔ نہ ان کے ذریعے ہماری نثر کے اسالیب میں کوئی اضافہ یا تغیر ہوتا ہے''۔[۱۰]

یعنی ترجمے کا جواز محض موضوع کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا نہیں۔ اصل چیز تو ترجمہ کے ذریعے ترقی یافتہ زبانوں کے اسالیب کو اپنی زبان میں ڈھالنا ہے۔ محمد حسن عسکری نے ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ اردو کو اسلوبیاتی سطح پر روشنی نثر کے ترجموں سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ اردو نثر کی اسلوبیاتی روایت پر بات کرتے ہوئے عسکری صاحب نے اپنے دو اور مضامین (۱) ''قحط افعال'' اور (۲) ''ادب میں صفات کا مسئلہ'' میں بھی اسی نکتہ نظر کے تحت بات آگے چلائی ہے۔ ہمارے ہاں مترجمین نے ہمیشہ روانی اور سلامت کی ہی تمنا کی ہے، اور ہمارے اکثر ناقدین نے اسی روانی اور سلاست کو ترجمے کی خوبی گنوایا ہے۔ محمد حسن عسکری اس باب میں کہتے ہیں ''صرف 'روانی' کہہ دینے سے کام نہیں چلتا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا چیز رواں ہے اور اس کی رفتار اپنی نوعیت کے اعتبار سے کس قسم کی ہے اور پھر رواں ہے تو کس جگہ، سیدھے سادے ابتدائی جذبات کی رفتار اور ہوگی، پیچیدہ تجربات کی اور، پھر جب خیال اور جذبہ مل جائے تو اور ان سب سے ایک ہی قسم کی روانی طلب کرنا تخلیق کا گلا گھونٹنے کے برابر ہے''۔[۱۱]

یہ بات ترجمے کے باب میں بھی سو فیصد درست ہے۔ اچھے ترجمے کی بری خوبیاں تو یہی ہیں کہ اصل متن کے جملوں کی ساخت اور لفظوں کی نشست تک ترجمہ کے ذریعے منتقل ہو۔ جبکہ ہمارے ہاں مترجمین نے دوسری زبانوں کے پیچیدہ اور طویل جملوں کو بھی دو دو، تین تین، چھوٹے اور رواں جملوں میں بانٹ کر ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے یہ ہوا کہ اس پیچیدہ اظہار کا لطف جاتا رہا جو مصنف کی منشاء اور عزیز ترین متاع تھی۔ ہمارے ہاں بیشتر مترجمین نے اس نوع کے تجربات سے گزرتے وقت یہ نہیں سوچا کہ اردو نثر کا بڑا مسئلہ تو طویل اور پیچیدہ جملہ لکھنے کا ہے اور اگر کسی ترقی یافتہ زبان کے فن پارے میں تخلیق کار نے پیچیدہ تر احساسات و جذبات کو لفظوں میں منتقل کرتے وقت یہ کارنامہ انجام دیا ہے، تو کوشش کر کے اسے انہی قواعد وضوابط کے ساتھ اردو میں کیوں نہ منتقل کر لیا، کہ اس سے ہماری زبان میں بھی اسلوبیاتی سطح پر کوئی نئی راہ سوجھنے کا امکان پیدا ہوتا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ اردو نثر میں گنجلک تجربات اور پیچیدہ جذبات کو سہارنے کی قوت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور اگر، لیکن، وغیرہ لگا کر جملوں کو

جوڑتے چلے جانے سے بڑا جملہ نہیں بنتا۔

یوں اس بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ ارنسٹ منینو لوسا ہوں، ایذرا پاونڈ یا ظ۔ انصاری، مترجم، مصنف کی فکر اور اسلوب سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اسے ایک طرف تو زیرترجمہ زبان کا کلچر اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسری طرف اس زبان کا کلچر، جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ مترجم کو ہر دو زبانوں کا مطیع و فرماں بردار رہنا ہی پڑتا ہے۔ یہ دوئی کی صورت مترجم کی اطاعت گزاری اس کی شخصیت کو لخت کرنے کے درپے رہتی ہے۔ لیکن یہ تو مترجم کا مقسوم ہے جس کے اجر کے طور پر اسالیب کی سطح پر اس زبان کو فائدہ پہنچتا ہے جس میں مترجم نے آنکھیں ٹپکا کر ترجمہ کیا۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ جملہ آراء ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی کتاب: ترجمے کا فن: ''نظری مباحث'' مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول: جون ۱۹۸۷ء سے انتخاب کی گئیں۔

۲۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر (مرتبہ): ''اردو زبان میں ترجمے کی مسائل'' (روداد سیمینار)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول: مارچ ۱۹۸۶ء، ص ۱۸

۳۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۴۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر: ''ترجمے کا فن: نظری مباحث'' (۴۶ قبل مسیح تا ۱۹۸۶ء)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول: جون ۱۹۸۷ء، ص ۱۰

۵۔ عبیداللہ، قدسی: ''اردو میں عربی اور فارسی کے ترجمے''، مطبوعہ: جریدہ: کراچی، شمارہ ۵، کراچی یونیورسٹی شعبہ تصنیف و ترجمہ، س ن

۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر: ''فن ترجمہ کے اصولی مباحث''، مشمولہ ''اردو زبان میں ترجمے کے مسائل''، مرتبہ: اعجاز راہی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول، مارچ ۱۹۸۶ء، ص ۴۳

۷۔ مولوی، عبدالحق: ''مقدمات'' (حصہ دوم)، کراچی، انجمن ترقی اردو، ص ۲۰۲

۸۔ دیکھئے: فن ترجمہ کے اصول از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مطبوعہ: اوراق، لاہور، بابت: اکتوبر، نومبر ۱۹۸۶ء۔

۹۔ دیکھئے: غلام علی الانا، ڈاکٹر، ''ادب میں تراجم کی اہمیت''، مشمولہ: اردو زبان میں ترجمے کے مسائل (روداد سیمینار)، مرتبہ: اعجاز راہی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول، ۱۹۸۶ء، ص ۲۵

۱۰۔ محمد حسن عسکری: ''گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے''، دیکھئے: ''مغرب سے نثری تراجم از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول: ۱۹۸۸ء، ص ۳۱۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۱۹